"بیع مؤجل"

مولانا محمد طاسین مدظلہ کے مقالے پر مولانا الطاف الرحمٰن بنوی کا محاکمہ اور مولانا محمد طاسین کا جواب مضمون

بیع مؤجل کی شرعی حیثیت کے بارے میں مولانا مفتی محمد سیاح الدین صاحب کاکاخیل" کا ایک وقیع مقالہ جنوری ۹۲ء کے "حکمت قرآن" میں اور اسی موضوع پر مولانا محمد طاسین مدظلہ 'صدر مجلس علمی کراچی' کی ایک مبسوط اور مفصل تحریر ماہنامہ "میثاق" کی جنوری ہی کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس مسئلے پر بحث کا دروازہ ہم نے کھلا رکھا تھا۔ ذیل میں مولانا بنوی صاحب کے تنقیدی مضمون اور اس کے جواب میں مولانا محمد طاسین صاحب کی نگارشات کو یکجا شائع کیا جا رہا ہے۔

پچھلے کئی سالوں سے ماہنامہ 'حکمت قرآن' لاہور میں مختلف فقہی موضوعات پر مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ کے بہت مفصل مضامین شائع ہوتے رہے ہیں' چنانچہ اب تک مزارعت' اجارے اور بیع مؤجل پر ان کے نہایت تحقیقی مقالے نظر سے گزرے ہیں۔ چونکہ احقر کو ادارۂ حکمت قرآن سے ایک گونہ نیاز حاصل ہے' لہٰذا ملنے جلنے کی رسم بھی جاری ہے۔ غرۂ شعبان کی ایک ایسی ہی ملاقات میں حکمت قرآن کے معاون مدیر جناب عاکف سعید صاحب نے مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ کے آخر الذکر مقالے پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ چونکہ بندہ کو اولاً تو ایسے امور میں جن پر ہماری متداول دینی کتابوں یا دیوبندی مکتبۂ فکر کے معروف فتاویٰ میں کوئی ترجیحی قول موجود ہو' از خود زیادہ سوچنے کی سرے سے عادت ہی نہیں' پھر اپنی سوچ کو کسی مرتب تحریری شکل میں پیش کرنا اور وہ بھی کسی فقہی مسئلے پر' جس کے ساتھ نہ کوئی ذہنی مناسبت نہ اسباب کتب وغیرہ میسر' مشکل در مشکل تھا' چنانچہ خاموشی میں عافیت سمجھتے ہوئے کنارہ کرلیا۔ لیکن کوئی ڈیڑھ مہینے کے بعد دوبارہ اسی فرمائش پر مشتمل مدیر صاحب کا خط موصول ہوا' چنانچہ اب چار و ناچار یہ چند اوراق سیاہ کرنے پڑ رہے ہیں۔

ادھار چیز نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت کے متعلق ابھی تک

علمائے کرام کے تین مقالے باصرہ نواز ہوچکے ہیں' جن میں سے دو مقالوں میں اس کا عدمِ جواز اور ایک میں جواز ثابت کیا گیا ہے۔ 'میثاق' اور 'حکمت قرآن' لاہور جنوری ۱۹۹۲ء میں بالترتیب مولانا محمد طاسین صاحب اور مولانا مفتی سیاح الدین صاحب مرحوم کے مقالات شائع ہوئے ہیں جو حکمِ عدم جواز پر مشتمل ہیں اور 'الحق' اکوڑہ خٹک فروری مارچ کے شمارہ میں مولانا قاضی عبدالکریم صاحب مدّ ظلہ کا مضمون چھپا ہے' جس میں دونوں مقالوں کا مختصر سا جواب دیا گیا ہے۔ چونکہ احقر کا رجحان بھی جواز کی طرف ہے' لہٰذا دونوں مقالوں میں سے بالخصوص مولانا محمد طاسین صاحب مد ظلہ کے مقالے کی بنیادی باتوں پر اپنی گزارشات پیش کررہا ہوں' اس لئے بھی کہ دونوں کے دلائل تقریباً ایک جیسے ہیں اور مولانا محمد طاسین صاحب مد ظلہ کو ان جیسے پرانے مسائل پر نئی تحقیقات پیش کرنے میں کسی قدر اولیت حاصل ہے اور اس لئے بھی کہ مولانا مفتی سیاح الدین صاحب مرحوم اپنے خدا کے حضور پہنچ چکے ہیں اور میری معروضات کا جائزہ نہیں لے سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ مغفرت نصیب فرمائے۔

مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ نے اثباتِ مدّعا کے لئے تین طریقے اختیار فرمائے ہیں: (۱) قیاس (۲) سورۃ النساء کی آیت سے استدلال (۳) حدیث سے استدلال۔ "اصل میں دونوں ایک ہیں" کے زیرِ عنوان مولانا محترم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> "...... صاف نظر آتا ہے کہ یہ معاملہ اپنی حقیقت و ماہیت' اپنے منشأ و مقصد اور اپنے لازمی اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربٰوا النسیئہ جیسا معاملہ ہے۔ وہ اس طرح کہ اس میں ایک شے جس کی قیمت نقد سے بازار میں عام طور پر مثلاً ایک سو روپے ہوتی ہے جب ایک سال کے ادھار پر وہ ایک سو پچاس روپے میں بیچی جاتی ہے تو اس میں پچاس روپے کا جو اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک سال کی مدت و مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے' نیز جس طرح ربوا النسیئہ میں مقروض سے قرض کے اصل مال پر زائد لیا جانے والا مال بلا عوض ہوتا ہے' اور مقروض کی حق تلفی قرار پاتا ہے' اسی طرح زیر بحث معاملے میں بیچی جانیوالی شے کی اصل قیمت پر ادھار کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے بیچنے والے کی طرف سے خریدار کے لئے اس کا کوئی معاوضہ موجود نہیں ہوتا' لہٰذا بیچنے والا جو زائد لیتا ہے خریدار کا

حق لیتا ہے اور اس کی حق تلفی کرتا ہے' نیز جس طرح ربوا النسیۂ میں قرض دہندہ کا مقصد بغیر کسی دماغی و جسمانی محنت و مشقت کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ضمانت کے اپنے سرمائے اور تمول کو بڑھانا ہوتا ہے' اسی طرح زیر بحث بیع مؤجل کے معاملے میں فروخت کنندہ کا مقصد بغیر کسی پیدا آور محنت اور عملی جدوجہد کے اور بغیر نقصان برداشت کرنے کی کسی ذمہ داری کے نفع کمانا اور اپنے سرمائے کو بڑھانا ہوتا ہے' پھر جس طرح ربوا النسیۂ کے رواج سے معاشرے میں معاشی عدم توازن اور غیر فطری نشیب و فراز رونما ہوتا ہے اور ملکی دولت چند اغنیاء اور سرمایہ داروں کے درمیان سمٹ کر رہ جاتی ہے اسی طرح زیر بحث معاملہ کے بھی عام رواج سے معاشرے میں ویسی ہی معاشی حالت پیدا ہوتی ہے۔ غرضیکہ وہ تمام اخلاقی' معاشرتی اور معاشی برائیاں جو ربوا النسیۂ کے عملی رواج سے ظہور میں آتی اور معاشرے کے توازن کو بگاڑتی ہیں اور جن کی وجہ سے اسلام نے ربوا النسیۂ کو قطعی طور پر حرام اور ممنوع ٹھہرایا ہے وہ سب زیر بحث بیع مؤجل کے معاملے سے بھی لازماً ظہور میں آتی ہے' لہٰذا اصولِ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس معاملے کا بھی وہی حکم ہونا چاہئے جو معاملہ ربوا النسیۂ کا ہے یعنی حرام' کیونکہ بنیادی طور پر ان کے درمیان کچھ فرق نہیں۔"

بلاشبہ مولانا محترم کی یہ طویل عبارت بہت اچھے اچھے فکر انگیز نکات پر مشتمل ہے' لیکن اس عبارت کے اول و آخر سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اس عبارت کا سب سے پہلا جملہ یہ ہے کہ "صاف نظر آتا ہے"۔ سوال یہ ہے کہ بیع مؤجل کا یہ معاملہ کوئی آج کے دور کی پیداوار تو نہیں' مدتوں سے انسانی دنیا میں رائج اور لین دین کی مختلف صورتوں میں ایک صورت کے طور پر متعارف چلا آرہا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس رائج الوقت اور کثیر الوقوع عقد کی حرمت کے بارے میں نبی علیہ السلام' صحابہ کرامؓ اور ائمہ عظامؒ سے کوئی صراحت منقول نہیں۔ اگر ہوتی تو مولانا محترم یقیناً اپنے قیاس سے پہلے اسی کو نقل فرماتے۔ معلوم ہوا کہ اتنا صاف نظر نہیں آتا جتنا کہ مولانا محترم کا خیال ہے۔

مولانا محترم کی عبارت کا آخری جملہ یہ ہے کہ "بنیادی طور پر ان کے درمیان کچھ فرق نہیں"۔ سو عرض ہے کہ دونوں کے درمیان بہت بڑا بنیادی فرق ہے اور وہ یہ کہ'

جیسا کہ اہلِ علم پر مخفی نہیں' اسلام نہ تو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح انسانی ملکیت کو بالکلیہ بے قید و بے لگام چھوڑتا ہے اور نہ اشتراکیت کی طرح اس کی کلیۃً نفی پر مصر ہے' بلکہ وہ ان دونوں کے بیچ بیچ میں ایک ایسے اعتدال کا قائل اور علمبردار ہے جس میں ملکیتوں کے احترام اور ان کی آزاد فعالیت کی بھی پوری پوری گنجائش ہو اور دوسروں کے حقوقِ عامہ کی پامالی اور حق تلفی پر بھی ضروری قد غنیں ہوں۔ زیر بحث مسئلہ میں کوئی شخص کسی عین کا بلا شرکتِ غیر جائز مالک ہے اور جیسا کہ معلوم ہے انسانی دنیا میں اعیان مقصود ہیں اور اثمان وسائل ہیں۔ اعیان کی قدر و قیمت غیر متعین ہوتی ہے' مختلف لوگ اپنے اپنے داخلی و خارجی حالات کی وجہ سے اس کی مختلف قیمتیں لگاتے ہیں۔ اب ہر طرف سے طالبین اس مالکِ عین کے پاس آتے ہیں اور اپنے اپنے حالات کے نقطۂ نظر سے اس کی بولیاں دیتے ہیں۔ مالکِ عین ان میں سے کسی بھی بولی کو رد یا اختیار و قبول کرنے کا حق رکھتا ہے۔ بازاری نرخ کسی بھی چیز کی قدر و قیمت کا ایسا حقیقی پیمانہ نہیں جس پر زیادتی لازماً اس چیز کی قدر و قیمت پر زیادتی ہو' حتیٰ کہ اس زیادتی کے لئے اس چیز کی ذات سے خارج کسی اور چیز کا مقابل ٹھہرانا ناگزیر ہو۔ نبی علیہ السلام نے تسعیر کو اسی لئے تو منع فرمایا ہے کہ اعیان کی اصل قدر و قیمت کا تعین انسانی بس کا کام نہیں۔ چنانچہ یہ کہنا کہ بازاری نرخ اس مملوکہ عین کی اصل قدر و قیمت ہے اور اس پر اضافہ قطعاً اجل اور میعاد کے مقابلے میں ہے' صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ زیادتی قطعی طور پر اجل کے مقابلے میں ہوتی تو مولانا کے پاس اس فقہی جزئیے کی تصحیح کی کیا توجیہہ باقی رہے گی جس کو انہوں نے صاحبِ ہدایہ کے حوالے سے یوں نقل فرمایا ہے: **"وان استھلکہ ثم علم لزمہ بالف و مائۃ لان الاجل لا یقابلہ شیء من الثمن"**۔ بقول مولانا محترم اگر پچاس روپیہ کا اضافہ اجل ہی کا عوض ہے تو کیوں مشتری کو یہ عوض بھی دینے پر مجبور کیا جارہا ہے۔

اب آیئے ربوا النسیئہ کی طرف۔ اس میں معقود علیہ کوئی غیر متعین القدر عین نہیں ہوتا بلکہ متعین القدر اثمان ہوتے ہیں' عام اس سے کہ پہلے ہی سے معلوم اثمان ہوں' جیسے **"والرّبوا الذی کانت العرب تعرفہ و تفعلہ انما کان قرض الدّراھم والدّنانیر الی اجل بزیادۃ علی مقدار ما استقرض علی ما یتراضون"** (احکام القرآن لابی بکر رازی' ج-۱) یا کسی عین کی خرید و فروخت کے نتیجے میں بائع و مشتری کے درمیان طے شدہ ہوں'

جیسے " **عن قتادۃ قال انّ ربوا الجاهلیۃ بیع الرجل المبیع الی اجل مسمّی فاذا حل الاجل و لم یکن عند صاحبہ قضاء زادہ و اخّرعنہ**" (تفسیر الطبری' ج- ۳) اب ان اثمان پر اضافہ چاہے بالاجل ہو چاہے بغیر الاجل ہو بہر حال ناجائز اور حرام ہے۔ بالاجل اس لئے کہ نقود متعین القدر وسائل ہیں تو اضافہ لازماً اجل کی طرف منسوب ہو گا جو ربوا النسیئہ ہے اور از روئے قرآن حرام ہے اور بغیر الاجل اس لئے کہ ربوا الفضل ہے' جو از روئے حدیث ممنوع ہے' اور کیوں ممنوع ہے اس کا کسی قدر بیان مصالح عقلیہ کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں میں ملے گا۔

بیع المؤجل اور ربوا النسیئہ کے درمیان اس بنیادی فرق کے واضح ہو جانے کے بعد مولانا محترم کے بیان کردہ وجوہِ مشابہت میں سے صرف آخری وجہ قابلِ توجہ باقی رہ جاتی ہے' یعنی یہ کہ ربوا النسیئہ کی طرح بیع مؤجل کی اس صورت کے عام رواج سے بھی معاشرے میں معاشی عدم توازن رونما ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اگر ان بے شمار دوسرے عقود و معاملات کو جو شریعت کی نگاہ میں حتماً ناجائز ہیں' مثلاً بیع معدوم' بیع قبل القبض اور احتکار وغیرہ عملاً روکا جائے تو بیع مؤجل کی اس صورت کا عام رواج بھی خود بخود ختم ہو جائے گا اور اس کو الگ سے حرام کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔

اس کے بعد مولانا محترم نے سورۃ النساء کی آیت "**لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ**" میں الباطل کے لفظ سے استدلال فرمایا ہے اور حسن بصریؒ اور علامہ رشید رضاؒ کے اقوال نقل فرمائے ہیں کہ باطل وہی چیز ہوتی ہے جو بغیر عوض یا بغیر مقابلہ شے حقیقی کے ہو اور چونکہ زیر بحث صورت میں بازاری نرخ پر اضافہ اسی قبیل میں سے ہے لہٰذا باطل اور پھر حرام ہے۔ لیکن جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا گیا صورت زیر بحث میں جو کچھ بائع و مشتری کے درمیان طے پایا ہے وہ سب اسی عین کا بدل ہے جو ایک شے حقیقی ہے' لہٰذا حرمت کا حکم لگانا مشکل ہے۔

اس کے بعد مولانا محترم نے بلوغ المرام سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت بایں الفاظ نقل فرمائی ہے: **قال رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کلُّ قرضٍ جرّ منفعۃً فھو الرِّبٰوا**۔ اور اس پر ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص مثلاً ایک سو روپیہ کی چیز ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کرتا ہے وہ پچاس روپے جو زائد لیتا ہے اس کا مطلب اس کے سوا

اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ قرض سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ مولانا محترم کی خدمت میں گزارش ہے کہ یہاں تو ہمارے خیال میں قرض سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ کوئی قیمت طے کرنے اور مشتری کا مبیعہ پر قبضہ کرنے سے پہلے تو نہ بائع مقرض ہے اور نہ مشتری مقروض' چنانچہ ابھی تو قرض وارد اور متحقق ہی نہیں ہوا' اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا سوال؟ ہاں تعینِ ثمن اور قبضۂ مشتری کے بعد مشتری مقروض ہوگیا ہے' لیکن اس کے بعد تو اس قرض سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے' جس قدر ثمن باہم طے تھا وہی لیا اور دیا جارہا ہے۔ قرض سے فائدہ اٹھانے کی جتنی مثالیں اور نظائر فقہائے کرام نے بتلائے ہیں مولانا محترم ان پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان سب میں تحققِ قرض کے بعد ان سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اگر قرض ثابت ہی نہ ہو تو "جرّ نفعًا" کے کیا معنی؟

اس کے بعد مولانا محترم نے "ہمارے علمائے کرام کا موقف اور اس کی اساس" کے زیر عنوان ارشاد فرمایا ہے کہ:

> "..... جو اہل علم حضرات معاملہ زیر بحث کے جواز کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں نہ قرآن مجید کی آیت پیش کرتے ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث' نہ آثارِ صحابہ و تابعین میں سے کوئی اثر' نہ ائمہ مجتہدین کا کوئی اجتہادی قول اور نہ مسلّمہ قواعدِ فقہیہ میں سے کوئی قاعدہ پیش فرماتے ہیں بلکہ اس کے ثبوت میں بطور دلیل فقہ حنفی کی دو کتابوں "مبسوط" اور "ہدایہ" کی ایک ایسی عبارت پیش کرتے ہیں جس سے کسی طرح یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ادھار پر کوئی چیز نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت پر بیچنا' خریدنا شریعتِ اسلامی کی رو سے جائز ہے۔"

پھر مولانا محترم نے مبسوط کی یہ عبارت "**ثم الانسان فی العادۃ یشتری الشیء بالنسیئۃ باکثر مما یشتری بالنقد**" اور ہدایہ کی یہ عبارت "**الا یری انہ یزداد فی الثمن لاجل الاجل**" پیش فرمائی ہے' اور پھر دونوں عبارتوں کے محلِ وقوع اور سیاق و سباق کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ یہاں پر ان دونوں کتابوں کے عظیم مصنفین کوئی شرعی حکم نہیں بیان فرمارہے ہیں بلکہ لوگوں کی عادت اور ان کی ایک عام کمزوری ذکر فرمارہے ہیں۔ مولانا محترم کی خدمتِ عالیہ میں بصد ادب گزارش ہے کہ مجوزین حضرات نے زیر بحث صورت

کا جواز ان عبارات سے نہیں نکالا ہے بلکہ اس سے نکالا ہے کہ اس صورت کے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں اور جیسے کہ بکرات و مرات مولانا محترم کی نظروں سے یہ فقہی کلیہ گزرا ہوگا کہ **"الاصل فی الاشیاء الاباحة"** چنانچہ اسی کلیے کی رو سے یہ صورت بھی جائز قرار پاتی ہے۔

باقی رہیں مبسوط اور ہدایہ کی عبارتیں تو جس طرح ان سے جواز نہیں نکلتا ہے بعینہ اس طرح عدم جواز بھی نہیں نکلتا ہے۔ دونوں بزرگوں کا موقف معلوم کرنے کے لئے دوسرے دلائل کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یہ رجوع کرنا اس بے بضاعت کے لئے تو قطعاً آسان نہ تھا' کیونکہ نہ صرف مبسوط بلکہ امام سرخسی کی کوئی کتاب بھی میرے پاس موجود نہیں اور ہدایہ تو اگرچہ موجود ہے لیکن اول تو یہ ضروری نہیں کہ صاحبِ ہدایہ کا اپنا موقف لازماً ہدایہ ہی میں مذکور ہو' ثانیاً بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مسئلہ کسی کتاب میں موجود تو ہوتا ہے لیکن بہت ہی ادنیٰ مناسبت سے کسی ایسی غیر متعلقہ جگہ میں' جس کی طرف کسی غیر متخصص کا ذہن عام طور پر منتقل نہیں ہوتا' لیکن اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے زیر بحث مسئلہ پر لکھنے والے دوسرے دو مقالہ نگاروں کو کہ انہوں نے مبسوط و ہدایہ کی وہ جگہیں بھی ڈھونڈ نکالی ہیں جن سے صاحبِ مبسوط اور صاحبِ ہدایہ کے اپنے اپنے موقف پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

محترم مولانا قاضی عبدالکریم خان صاحب مدظلہ نے صاحبِ مبسوط کا موقف بتلانے کے لئے مبسوط ہی کی یہ عبارت نقل فرمائی ہے: **وهذا اذا افترقا على هذا فان كانا يترا ضيان بينهما ولم يتفرقا حتى قاطعا على ثمن معلوم واتما العقد فهو جائز لانهما ما افترقا الا بعد تمام شرط صحة العقد** یعنی اگر کسی بائع نے مشتری سے کہا کہ اس چیز کی نقد قیمت اتنی ہے اور ادھار اتنی ہے اور خریدار نے کہا کہ منظور ہے' لیکن یہ واضح نہیں کیا کہ ان دو میں سے کونسی صورت منظور ہے اور چلا گیا تو یہ عقد صحیح نہیں' کیونکہ عوض متعین نہیں بلکہ متردد ہے اور نبی علیہ السلام کی حدیث **"انه نهى عن شرطين فى بيع"** کا امام سرخسی کے نزدیک یہی مطلب ہے اور اگر بائع و مشتری کے درمیان کوئی ایک صورت طے ہو گئی' چاہے نقد والی ہو چاہے ادھار والی' تو عقد صحیح ہے اور جائز ہے اور مولانا مفتی سیاح الدین صاحب مرحوم نے اپنے مقالے میں ایک جگہ ہدایہ کی یہ عبارت

نقل فرمائی ہے: "وهو مکروه لمافیه من الاعراض عن مبرة الاقراض مطاوعة لمذموم البخل"۔ اس عبارت سے بالخصوص اسی زیرِ بحث صورت کے متعلق صاحب ہدایہ کا موقف معلوم ہوگیا ہے کہ وہ اس صورت کو مکروہ کہتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ فقہی اصطلاح میں مکروہ کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے، مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی۔ مکروہ تنزیہی اور خلافِ اولیٰ کی سرحدیں ملتی جلتی ہیں۔ صاحبِ ہدایہ کی عبارت میں اگر مکروہ کا لفظ مکروہ تنزیہی پر محمول کیا جائے تو صاحبِ ہدایہ کا شمار بھی علامہ سرخسی کی طرح مجوزین میں ہوگا، کیونکہ مکروہ تنزیہی جائز ہی ہوتا ہے۔ صاحب ہدایہ کے کلام کی یہ توجیہہ اس ہیچمدان کا اپنا تصرف نہیں بلکہ اس کی بنیاد "ردِ محتار شامی" کی یہ عبارت ہے:

"(قوله ای بیع العینة بالربح) ای بثمن زائد نسیئة (قوله وهو مکروه) ای عند محمد وبه جزم فی الهدایة قال فی الفتح، وقال ابو یوسف لا یکره هذا البیع لانه فعله کثیر من الصحابة الخ وقال محمد هذا البیع فی قلبی کامثال الجبال ذمیم اخترعه اکلة الربا وقد ذمهم رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال اذا تبایعتم بالعینة واتبعتم اذناب البقر ذللتم وظهر علیکم عدوکم قال فی الفتح ما حاصله یقع فی قلبی انه اذا فعلت صوره یعود فیها الی البائع جمیع ما اخرجه او بعضه فیکره یعنی تحریمًا فان لم یعد کما اذا باعه المدیون فی السوق فلا کراهة فیه بل خلاف الاولٰی وما لم ترجع الیه العین التی خرجت منه لا یسمی بیع العینة واقره فی البحر والنهر والشرنبلالیه وهو ظاهر وجعله السید ابو السعود محمل قول ابی یوسف وحمل قول محمد والحدیث علی صورة العود"۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ بیع مؤجل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بیچنے والا کوئی چیز خریدار کے ہاتھوں ادھار پر مہنگے داموں بیچے اور پھر وہی چیز اس خریدار یا اس خریدار کے خریدار سے سستے داموں خرید لے۔ اور دوسری قسم یہ کہ خریدنے والا مہنگے داموں خرید کر اسی چیز کو بازار میں سستے داموں بیچ لے اور وہ چیز دوبارہ پہلے بیچنے والے کے ہاتھوں نہ پہنچے۔ پہلی قسم کی بیع کو بیع عینہ کہتے ہیں۔ اسی کو امام محمدؒ ناجائز کہتے ہیں اور یہی حدیث مذمت کا مصداق ہے اور دوسری قسم بیع عینہ نہیں اور اسی کو امام ابو یوسفؒ

جائز کہتے ہیں۔

رد مختار شامی میں ایک دوسرے مقام پر فتح القدیر کا یہ قول نقل کیا ہے: "**قال فی الفتح و لا کراھۃ فیہ الا خلاف الاولی لما فیہ من الاعراض عن مبرۃ القرض**"۔ شامی کی ان نقول کی روشنی میں صاحب ہدایہ کے کلام کی مذکورہ توجیہ میں کوئی استبعاد باقی نہ رہا۔ گو عام طور پر مکروہ بلا قید کا اطلاق مکروہ تحریمی پر کیا جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں تسامحات کی کئی مثالیں فقہاء کرام کی کتابوں میں موجود ہیں --- اور یا پھر صاحب ہدایہ کا یہ حکم بیع عینہ کے متعلق قرار دیا جائے، جیسا کہ یہ بالکل واضح ہے، کیونکہ "**و ھو مکروہ**" سے پہلے عبارت یوں ہے: **و معناہ الا سر ببیع العینۃ مثل ان یستقرض من تاجر عشرۃ فیتابی علیہ و یبیع منہ ثوبا یساوی عشرۃ بخمسۃ عشر مثلا رغبۃ فی نیل الزیادۃ لیبیعہ المستقرض بعشرۃ و یتحمل علیہ خمسۃ سمّی بہ لما فیہ من الاعراض عن الدین الی العین و ھو مکروہ لما فیہ من الاعراض الخ**" اور بیع عینہ کے مکروہ ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ ہاں اس توجیہہ پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر صاحب ہدایہ کا مطلب وہی عینہ ہوتا جس کی حرمت و کراہت پر اتفاق ہے تو پھر چاہئے تھا کہ "**لیبیعہ المستقرض**" کے بعد "**من التاجر البائع**" کے الفاظ بھی ہوتے۔ اسی طرح سے اس صورت کی حرمت کی اصل دلیل تو نبی علیہ السلام کی احادیث ہیں، مثلاً **اذا تبایعتم بالعینۃ الخ**" وغیرہ تو **لما فیہ من الاعراض** سے پہلے یا بعد ان کا حوالہ دینا چاہئے تھا، تو عرض ہے کہ صاحب ہدایہ کی اختصار پسندی سے ایسی مساہلتیں ہرگز بعید نہیں--- اور اگر ہدایہ کے کلام میں کوئی بھی تاویل پسند خاطر نہ ہو تو کیوں نہ امام سرخسی کے قول کو ترجیح دی جائے جبکہ وہ فقہاء کے طبقہ ثالثہ میں سے ہیں اور صاحب ہدایہ اس مقام کے آدمی نہیں!

بقیہ: شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رح

مولانا عبدالحق محدّث دہلوی کے والد ماجد مولانا سیف الدین تُرک کے قلم کی عبارت تحریر ہے"[1]

شیخ سیف الدین نے ۲۷ شعبان ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کو دہلی میں انتقال کیا[2]

(جاری ہے)

[1] مقالات سلیمان ج ۲، ص ۷۷ [2] اخبار الاخیار، ص ۲۹۰